پگھلا نیلم

میرے بعض دوستوں نے میری
چند نظموں کو سُن کر جب یہ کہا کہ "سجاد ظہیر
نئی قِسم کی شاعری کا تجربہ کر رہے
ہیں" تو میرے دل کو اس جملے سے بڑی
چوٹ لگی۔ تجربہ! یہ تو ویسی ہی بات
ہوئی اگر کسی عاشق سے یہ کہا جائے کہ وہ
جذبۂ محبّت کا تجربہ کر رہا ہے!
شاعری انسانیت کا لطیف ترین
جوہر ہے۔ اس کے اظہار کو تجربہ
کہنا بڑا ظلم ہے۔

سجاد ظہیر

سجّاد ظہیر

باراول :۔ تعداد ایک ہزار

قیمت :۔ تین روپے

مطبوعہ :۔ کوہِ نور پریس، دہلی

ناشر

نئی روشنی پرکاشن

وائی ۲۴ حوض خاص

نئی دہلی۔۱۶

اس مجموعہ کی بیشتر نظمیں گذشتہ تین چار سال کی مدت میں لکھی گئی ہیں۔
اس دوران میں نے اُنہیں اپنے دوستوں کی محفلوں اور بڑے
اجتماعات میں پڑھ کر سنایا اور ان میں سے بعض مختلف رسالوں
میں شائع بھی ہوئی ہیں۔ جن لوگوں نے انہیں پسند کیا ہے اُن
کی پسندیدگی کے اظہار سے مجھے خوشی ہوئی، لیکن جنہوں نے انہیں
پسند نہیں کیا اُن کے سنجیدہ اعتراضات کو میں نے بہت غور
سے سنا اور اُن سے بحثیں کیں اور تبادلۂ خیال کیا۔ اعتراض کرنے
والوں میں کئی ایسے لوگ ہیں جو میرے بہت قریبی دوست ہیں اور
جو خود بہت اچھے شاعر ہیں۔ ان سب کے اعتراضات ایک ہی نوعیت

کے نہیں ہیں، لیکن ان سب میں ایک بات مشترک ہے۔ میرے ان دوستوں کا کہنا ہے کہ میری ان نظموں میں "شعریت" تو یقیناً ہے لیکن انہیں نظم نہیں کہنا چاہیئے، اس لئے کہ ان میں نہ صرف روائتی بحروں کو نہیں برتا گیا ہے، بلکہ اِن میں سے بیشتر میں، اوزان اور ارکان کی بھی وہ پابندی نہیں رکھی گئی ہے، جو کہ آزاد نظموں میں ہوتی ہے۔ اِن دوستوں کا کہنا ہے کہ ایسی صورت میں اِنہیں نظم نہیں، بلکہ "شعری نثر" یا "نثری شعر" کہنا زیادہ درست ہوگا۔ ایک صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ مولانا ابو الکلام آزاد کی نثر، یا کرشن چندر کی نثر کے بعض جملوں میں اور میری طرح کی شاعری میں ہیئت کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔ ایک دوسرے صاحب نے یہ کہا کہ اُردو میں اس کے پہلے بھی "ادبِ لطیف" نام کی نثر لکھی جا چکی ہے، اور میری ان تحریروں کی نوعیت بھی وہی ہے —
فیض احمد فیض نے میری ان نظموں میں سے کئی سنی ہیں، اور چند کو انہوں نے پسند کیا۔ ایک نظم کے بارے میں ایک خط میں انہوں نے مجھے لکھا کہ "میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اِس کا نسخہ ترکیب استعمال

کیا ہے ؟" میرے نوجوان دوست راہی معصوم رضا نے از راہِ کرم
مجھ سے یہ نظمیں سنیں اور پھر انہوں نے بھی تقریباً وہی بات کہی جو
فیض نے پوچھی۔ فیض اور راہی کے سوالوں کے پیس یہ معنی سمجھتا
ہوں (جسے فیض نے بعد کو تفصیل کے ساتھ بیان بھی کیا) کہ مروجہ
اُردو شعر میں بحر، وزن اور رکن سے ایک مخصوص آہنگ پیدا ہوتا
ہے، صدیوں سے ہم نے اِن کی پابندی کی ہے اور یہی اِن اصول
کے مطابق کہی ہوئی نظموں کا "نسخہ ترکیب استعمال" ہے۔ لیکن اگر
ان اصول کے مطابق کوئی نظم نہ کہی جائے، تو پھر اِن نظموں میں وہ
شعری آہنگ کیسے پیدا ہوتا ہے، جو شعر کی ایک ضروری صفت
ہے۔ نیاز حیدر نے میری ان نظموں پر اپنی پسندیدگی کا اظہار
کرتے ہوئے ایک بڑی دلچسپ بات کہی۔ غالباً اُن کے دل میں بھی
وہی سوال اٹھا تھا جو فیض اور راہی نے اٹھایا ہے۔ اور اس
سوال کا نیاز نے خود ہی یہ جواب دیا کہ اِن نظموں کو موسیقی کے
سُروں میں ڈھال کر اگر گایا جائے تو بہت اچھا لگے گا۔ یعنی اس
طرح شعری آہنگ کی کمی پوری ہو جائے گی۔ بمبئی میں ادیبوں کی

ایک مجلس میں میرے دوست سکندر علی وجد نے جب میری نظموں پر یہ اعتراض کیا کہ ان کو نظم کہنا غلط ہے تو سردار جعفری نے اُن سے پوچھا کہ "ان میں شعریت ہے یا نہیں اور وہ انہیں اچھی لگتی ہیں یا نہیں "۔ اور جب وجد نے یہ کہا کہ " ہاں ان میں شعریت ہے اور انہیں اچھی لگتی ہیں"، تب سردار جعفری نے یہ کہا کہ " ایسی صورت میں ان کے نام پر بحث کرنے سے کیا فائدہ اگر وجد صاحب انہیں "نثری شعر" کہنے پر اصرار کرتے ہیں، تو وہ ایسا ہی کریں"۔ اس کے بعد یہ بحث ختم ہو گئی ۔

اِن سوالات پر اپنی رائے کا اظہار کرنے سے پہلے میں اس بحث کو محض ہیئت اور فارم کی سطح سے ہٹا کر دوسری سطح پر لے جانا چاہتا ہوں ۔ میرے نزدیک اصل سوال یہ ہے کہ شعر یا شاعری کیا ہے، ظاہر ہے کہ شعر کی ہیئت، تو وہ جسد ہے جس میں شاعری کی روح ہوتی ہے ۔ اگر یہ جسد بغیر شعر کی روح کے ہو، تو وہ شعر نہیں ہو سکتا ۔ ہمارے یہاں اسی کو تک بندی کہتے ہیں ۔ میرے فارسی اور عربی کے استاد اس کی مثال اس شعر

سے دیا کرتے تھے :-

لٹھے کو کھڑا کیا ، کھڑا ہے
ہاتھی کو بڑا کیا ، بڑا ہے

اس کے معنی یہ ہوئے کہ شعری ہیئت کی اہمیت اسی وقت تک ہے جبکہ وہ شاعری کی روح کے ساتھ وابستہ ہو۔ شعر کے الفاظ اور معنی فنّی تخلیق کا وہ خام مسالہ ہیں، جن سے کہ ایک شاعر ایک ایسے نئے اور نایاب، حسین اور لطیف پیکر کی تخلیق کرتا ہے جو ہمارے ذہن اور احساسات، جذبات، شعور پر ایک خاص قسم کا اثر ڈالتے ہیں۔ شاعر کی منطق، نثر کی منطق سے بالکل مختلف ہوتی ہے، وہ مختلف علامتوں تشبیہوں اور استعاروں کے وسیلے سے، ایک مصوّر، سنگ تراش یا معمار کی طرح ایسی دلآویز تخلیق کرتا ہے، جو ہم میں انبساط و سرور کی کیفیتیں پیدا کرتی ہے۔ اور جن سے زندگی کے حقائق، انسانی تجربوں، ذہنی اور نفسیاتی کیفیتوں پر ایسی عجیب اور دلکش روشنی پڑتی ہے، جن میں یہ سب بدلی ہوئی اُسی طرح نظر آتی ہیں، جیسے چاندنی میں درخت، پھول، عمارتیں، سبزہ زار یا صحرا اپنے دُرشت گوشوں، زاویوں اور

شباہتوں کو کھو کر ایک طلسمی اور کھنڈرے دھندلکے میں ڈوب جاتے ہیں۔
میرے نزدیک اصل سوال یہ ہے کہ ایک فنکار اپنی تخلیق کے لئے
اپنے خام مواد کو کس طرح استعمال کرتا ہے جس قدر زیادہ یہ مواد اُس
مفہوم اور مقصد کو ادا کرنے کے لئے صحیح اور مناسب طور سے استعمال
ہو گا جو کہ فنکار کا مدعا ہے، اس حد تک اُس کی تخلیق کامیاب ہو گی۔
اس خام مسالہ کی بذات خود کوئی اہمیت نہیں ہے۔ تاج محل کے مینار
گنبد، محراب، سنگ مرمر اور اُس پر بنی ہوئی نقاشی علیٰحدہ علیٰحدہ کوئی
اہمیت نہیں رکھتے۔ وہ اگر ضروری ہیں تو اسی لئے کہ معمار کے مجموعی
اور مکمل تصور کو شکل و صورت ادا کرنے کے لئے انہیں ایک خاص طریقے
سے اور ایک خاص تناسب کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔ آرٹ اور
شاعری کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ وہ مواد اور مسالہ جو ایک
بڑے فنکار کے ہاتھوں میں اس کے فنی پیکر کو ایک خاص شکل دینے
کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، اور اس لئے وہ ضروری اور مناسب
ہے، نقال فنکاروں کے ہاتھوں، وہی مسالہ، وہی طرز اور اسلوب
تقلید کے طور پر، اور رسماً استعمال ہونے لگتے ہیں۔

اس قسم کے طرز اور اسلوب سند بن جاتے ہیں، لوگ اُن کے عادی ہو جاتے ہیں، فن دہرایا جانے لگتا ہے، یا اُس میں اگر جدّت ہوتی بھی ہے تو قدامت کے حصاروں کے اندر رہتے ہوئے۔ اس طرح صدیاں گذر جاتی ہیں، یہاں تک کہ زندگی کے بدلے ہوئے حالات فن کار کو قدامت کے حصاروں کو مسمار کر کے بالکل نئی تعمیر کرنے، اور نئے طرز کی ایجاد کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ یہ نیا طرز نئے حالات زندگی سے زیادہ ہم آہنگ ہوتا ہے، اس میں قدیم فنّی تخلیق کی نقل نہیں ہوتی، لیکن ظاہر ہے کہ قدیم فنّی دولت اُس کی اہم ترین دولت ہوتی ہے، جسے اب وہ اپنے خام مسالے کی طرح استعمال کر کے اس دولت میں اضافہ کی کوشش کرتا ہے۔

میں بصد ادب اپنے معتبر ضیلن سے یہ درخواست کروں گا کہ وہ اس مجموعہ کی ہر نظم کو (سوا دو رسمی نظموں کے جو بہت پہلے کہی گئی تھیں اور آخر میں دے دی گئی ہیں) مجموعی حیثیت سے دیکھیں اور پڑھیں۔ میری عرض یہ ہے کہ میں نے جس قسم کی تخلیق کی کوشش کی ہے، جو اثر میں پیدا کرنا چاہتا ہوں، جس خاص کیفیت کا اظہار مجھے مقصود ہے اور جس شعری پیکر کی تخلیق

میرا مدعا ہے، وہ صرف اسی طرح سے ادا ہو سکتا ہے۔ دوسرے فن کار دو اس سے بدرجہا بہتر تخلیق کر چکے ہیں اور کریں گے، لیکن یہ تخلیق ناچیز بھی میری اپنی ہے۔

میرے بعض دوستوں نے میری چند نظموں کو سن کر جب یہ کہا کہ "سجاد ظہیر نئی قسم کی شاعری کا تجربہ کر رہے ہیں" تو میرے دل کو اس جملے سے بڑی چوٹ لگی۔ تجربہ! یہ تو ویسی ہی بات ہوئی اگر کسی عاشق سے یہ کہا جائے کہ وہ جذبۂ محبت کا تجربہ کر رہا ہے! شاعری انسانیت کا لطیف ترین جوہر ہے، اِس کے اظہار کو تجربہ کہنا بڑا ظلم ہے۔ یہ اظہار، ناکافی، ناقص یا نامکمل ہو سکتا ہے، لیکن اگر وہ نقالی، سطحی تفریح یا چٹکلے بازی نہیں ہے، اور اس میں خلوص، صداقت اور حُسن ہے تو وہ یقینی اس زندگی کا سب سے بیش بہا اور جانفزا عطر ہے۔

بحور، اوزان اور ارکین کے مروجہ طریقوں کو میں نے اراداً ترک نہیں کیا ہے، اور نہ جس قسم کی زبان اِن نظموں میں استعمال کی گئی ہے وہ زبان "تجربے" کی غرض سے ہے۔ اپنے شعری مقصود کو حاصل کرنے کے لئے مجھے نئے آہنگ اور نئے ترنم کی ضرورت تھی۔ یہ آہنگ اور

ترنم اُن معانی اور اُس مکمل فنی تخلیق کے ساتھ وابستہ اور پیوستہ ہے، جو میرا مدعا ہے۔ یقیناً آپ کو اس میں اجنبیت محسوس ہوگی، اس لئے کہ یہ روائتی نہیں ہے لیکن چونکہ یہ آہنگ نیا ہے، اس لئے میری نظر میں، یہ کسی قدر زیادہ دل فریب بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نئے آہنگ کو پیدا کرنا بے حد مشکل کام ہے، جس طرح موسیقی میں سروں کی روائتی ترتیب کو ترک کردینے سے گانے والا "بے سُرا" ہوجاتا ہے، جو بغیر کسی دشواری کے ممکن ہے، لیکن سُروں کی ایسی نئی ترتیب کرنا کہ اُس سے نیا راگ پیدا ہو بہت مشکل ہے، اسی طرح سے اس نئی طرح کی شاعری میں نئے آہنگ کا بھی مسئلہ ہے۔ بہر حال میں نے کوشش کی ہے، میری نظر میں یہ کامیاب ہے، لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ میں کامیاب نہ ہوا ہوں۔ اس کا فیصلہ غیر متعصب اہلِ نظر کریں گے۔

مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں اگر کوئی شاعری کے متعلق اپنے روائتی تصوّرات سے مجبور ہو کر ان نظموں کو "نثری شعر" کہتا ہے۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ اصلی اور اچھی شاعری بحر، وزن یا قافیہ کی پابندی کے ساتھ بھی کی جاسکتی ہے اور کی گئی ہے، اور ان کے بغیر بھی۔

بدقسمتی سے اس وقت شاعری کی وہ پابندیاں جو ایک بڑے فنکار کے ہاتھوں میں شعری تخلیق اور شعری آہنگ کے کسی خاص مقصد کو حاصل کرنے کے لئے استعمال کی گئی تھیں، اب روائتی طور پر، اور رسم و رواج کی طرح برتی جاتی ہیں۔ شعری تخلیق کا اصلی مقصود بیشتر بھلا دیا گیا ہے۔ دوسری طرف اس کا بھی امکان ہے، کہ ان پابندیوں سے بَری ہو کر جو شاعری کی جائے اُس میں بھی شاعری کی اصلی روح مفقود ہو اور اگر ایسا ہوا تو وہ اُس روائتی شاعری سے بھی زیادہ بُری ہو گی، اس لئے کہ اُس میں وہ مصنوعی آرائشیں اور گُل بوٹے بھی نہ ہوں گے، جو پُرانی قسم کی شاعری میں، اس کے افلاس کے باوجود لامحالہ موجود رہتے ہیں۔ بہرحال شاعری کے متعلق بحث زیادہ کارآمد نہیں ہوتی۔ میں امید کرتا ہوں کہ میں یہاں پر جو کچھ پیش کر رہا ہوں آپ اُس سے لطف اندوز ہوں گے، اور اگر سب نہیں تو چند نظمیں آپ کو پسند آئیں گی۔

سجّاد ظہیر

نومبر ۱۹۶۴ء
دہلی

پُرانا باغ

کیسا سنّاٹا ہے یارب،
اور کیسی تلملاتی مضطرب تنہائی ہے،
آوازیں آتی ہیں، لیکن،
ملی جُلی،
اونچی نیچی،
معنی مطلب کو صرف،
ذرا سا چھوکر
اِدھر اُدھر بہہ جاتی ہیں،

اک یاد کی خوشبو آتی ہے،
رنگین، منقش،
تتلی کے تھرتھراتے پر جیسے،
لیکن، وہ بھی
اک جھونکا لے کر
اُڑ جاتی ہے!

ہونٹوں سے کم

ہونٹوں سے کم،

گرم مہکتی سانسوں سے،

نم آنکھوں سے،

تم نے پوچھا :

"کیا ہم سے محبت کرتے ہو ؟"

بس ایک حرف منہ سے نکلا،

"ہاں !"

کتنا معمولی،

چھوٹا سا،

یہ نامکمل لفظ ہے!

کیسے دکھلائیں تم کو

اُس پوشیدہ، خوابیدہ

وادی کو

جِس میں

نور کی بارش ہوتی ہے،

جھرنے بہتے ہیں نغموں کے،

اور لمبے، قدآور پیڑ چنار کے،

اپنے جھِل مِل، سبز، خُنک سایوں کو

پھیلاتے ہیں

جیسے خود جینے کے رَستے!

یہ سب دولت، دِل کو

تم نے ہی تو دی ہے!

آج رات

آج رات — تم آئی ہوتیں،

جاڑا اور اندھیرا ہم نے،
چھوٹے سے کمرے سے اپنے
بالکل باہر پھینک — دیا تھا
ویسے جیسے روز صبح کو
جھاڑو دیکر،
مٹی، گرد اور ایش ٹرے کی
راکھ نکالی جاتی ہے

دوستوں کی سانسوں کی گرمی
باتوں کی رَو
پگھل رہی تھی
سگرٹ کے خاموش دھوئیں میں
ذہن ہمارے جھک رہے تھے
اپنے کو ہم بھول گئے تھے :

کب — آخر کب

دیس ہمارا اونچا ہو گا ؟
ہندی، اُردو، پنجابی کب
دودھ میں شکر ہو جائیں گی ؟
بھارت — ماں کی ممتا
کب پروان چڑھے گی ؟
کب انمول انوپ رتن
ساہت کے ہم
چرنوں میں اُس کے بھینٹ کریں گے ؟

اِس یُگ کے کب

کالی داس، کبیر، میر

میرا، تُلسی

وارث، غالب

چمکیں گے آکاش پہ اپنے؟

گھونگھٹ کاڑھے، آنکھ چُرائے، چھم چھم کرتی،

سب کے دل کی رانی، کویتا،

کب آئے گی؟

نو جیون کی اُشا کی لالی

برکھا بن کر

برسے گی کب

اِس دھرتی پر؟

دُور بہت ہی دُور سہی تم،

آجاتیں بس اک رات کو،

تھوڑی دیر کو ،

دوستوں سے ہم پھر یہ کہتے :

"اِن سے ملئے

یہ آشا ہیں ،

آج ہمارے پاس رہیں گی ،

کل بھارت کے ہر آنگن میں

اِن کے گیت کا رس ٹپکے گا

اور اِن کے گھنگرو کی چھن چھن

سب کے من میں سنائی دے گی !

اور اِن کی بانی کا امرت

ہم سب کو پینے کو ملے گا

اور یہ دُکھ کی ماری دھرتی

کروٹ لے کر جاگ پڑے گی

دیس ہمارا اونچا ہوگا !"

آج رات تم آئی ہوتیں
ڈور بہت ہی دور سہی تم
آجاتیں، بس ایک رات کو
تھوڑی دیر کو!

تصویریں

ایک رنگ میں سینکڑوں رنگ ہوتے ہیں
ہلکے، گہرے، مدھم، شفّاف
روشنیوں سے بھرے، چمکتے، جگمگاتے
سُرمئی، ابریشمی نقابیں ڈالے
گُھلے مِلے،
دھوپ چھاؤں کی آنکھ مچولی کھیلتے،
انوکھے نقوش میں اُبھرے اُڑتے ہوئے
یا بھرا تنے گمبھیر

جیسے جہازوں کے لنگر!

اِن میں لہریں ہوتی ہیں،

تڑپتی، بے چین، طوفانی

اور ایسی بھی،

جن پر سکون کے سائے

چھائے ہوتے ہیں

لیکن اُن کے نیچے

پہاڑی جھرنوں کی تیزی، تلملاہٹ

جستجو کی لہک

آرزو کی پاگل مہک

چھپی ہوتی ہے

اور جب کئی رنگ

اُن کی بے شمار ترنگیں

طرح طرح کی چھوٹی بڑی

چھپی اور ظاہر لہریں

ملتی ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں
تب نئے حیرتناک ہیولے
آدھے پورے بَل کھاتے دائرے
موہوم نقطے
تھرتھراتی لکیریں
لاجواب شکلیں
اور ایسے پیکر جو کسی دوسری چیز کی طرح نہیں ہوتے
لیکن جو خود اپنی الگ انوپ ہستی ہیں
نئی نویلی دولہن
نوزائیدہ بچّے کی طرح
اچھے لگتے ہیں
وجود میں آجاتے ہیں
جھلملاتے ذہنوں کا یہ شعلہ
انسانی انگلیوں، ذہن اور روح کا یہ کرشمہ
زمان کا یہ جوہری دھماکہ

زندگی کو پَر لگا دیتا ہے
اُسے اتنا اونچا اُڑا لے جاتا ہے
جہاں سے اِس دھرتی
اور اُس پر بسنے والوں کو
ہم یوں دیکھتے ہیں
جیسے تینتوف نے اُسے دیکھا تھا
اور اُس کی سب اچھائیوں،
خوبصورتیوں
اُس کی خوشبوؤں
لطافتوں، رنگینیوں کا پَرتَو
ہماری روحوں پر بھی پڑتا ہے
ہم بدل جاتے ہیں!
ایسا ہی ایک چِتر
تم نے معلوم نہیں،
کن آسمانی رنگوں سے کھینچا

اپسراؤں کی نجانے کیسی جادو مدراؤں سے بنرا
سورگ کے کون سے مدھر راگوں میں ڈھالا
اور چپکے سے
من کے گرم، تپتے آنگن میں رکھ دیا
دفعتاً ہزاروں بہاریں جاگ پڑیں
گلابی پنکھڑیاں برسنے لگیں
مہکتی ہواؤں سے
ہلکی ہلکی ٹھنڈی نرمیاں ٹپک پڑیں
اور زندگی کی خالی مانگ
سیندور رسے بھر گئی!

دریا

آؤ میرے پاس آؤ نزدیک
یہاں سے دیکھیں
اِس کھڑکی سے باہر
نیچے اک دریا بہتا ہے
دُھندلی دُھندلی ہلتی تصویروں کا
خاموشی سے بوجھل
زخمی سایوں میں
تیر چھپائے تھرتھراتے، جلتے،
کناروں کے پہلو میں
بے کل، دُکھی
اُسے بھی نیند نہیں آتی !

باڑھ

ندی کی لہریں،
سوتے سوتے،
جیسے اِیکدم جاگ پڑیں،
اور جھپٹ پڑیں،
اُن گیلے گیلے
مٹی بالو کنکر
پتھّر اور سیمنٹ کے
پُشتوں پر

جن سے اُن کو باندھ کے
سب نے رکھ چھوڑا تھا ،
لہک لہک کر،
ناچ ناچ کر
شور مچاتی ،
چاروں اُور ،
گلی گلی کوچے کوچے میں،
گھروں میں ، صحنوں میں ، کمروں باغوں میں ،
کونے کونے میں وہ ،
جھٹ پٹ ،
گھُس آئیں
چڑھ دوڑیں !
کوئی چیز نہ چھوٹی اُن سے ،
برتن ، باسن ،
زیور ، کپڑے ،

کرسی میز

کتابیں،

بھولے بسرے

خط پتّر،

تصویریں،

دستاویزیں

تحریریں

بیکار پڑیں چیزیں،

وہ جن کے ہونے کا بھی پتہ نہ تھا،

لہروں نے اُن کو گھیر لیا،

دامن میں اپنے

کھینچ لیا

کیچڑ، مٹی میں لت پت کر ڈالا

اور سب کچھ لے کر ڈوب گئیں!

پھر جیسے ایکدم آئی تھیں،
ویسے ہی ہر ہر کرتی،
بل کھاتی، اٹھلاتی
نکل گئیں!

(۲)

اے کاش، دلوں میں، روحوں میں،
ایسی اک چنچل باڑھ آئے،
بیکار ڈروں کے ڈھیروں پر،
ہمت کی لہریں بکھرا دے،
خود غرضی کے صندوقوں کو
اک جھٹکا دے کر الٹا دے،
پھاڑے لالچ کی پوٹوں کو،
جالوں کو، جہل و شقاوت کے،
اور ظلم کی گندی مکڑی کو

چکنی کالکھ کو تعصب کی،

نابود کرے، ناپید کرے،

یوں نم کردے دل کی کھیتی،

امیدیں سب لہرا اُٹھیں

گلنار شگوفے اُلفت کے

سُوکھی جانوں سے پھوٹ پڑیں!

اے کاش دلوں میں روحوں میں

ایسی اک چنچل باڑھ آئے

نادانی

ٹھنڈے لفظوں کے چھینٹوں سے
بڑی سمجھ داری سے آؤ،

اِس جنجال سے
اپنا دامن کھینچ کے

ہم اچھے بن جائیں،
پاک، صاف اور نیک — !
بُجھا دیں دِل کی آگ،

اپنے ہاتھوں،

اپنی راہ میں کانٹے بونا
اپنا ہی خود دشمن بننا ،
اپنے خون کے پیاسے ہونا
سِسک سِسک کر مرنا
اپنی قبر کھودنا
پیار کے پیچھے پاگل بننا
جان ہتھیلی پر لے کر
یوں پھرنا ،
جیسے اس کا کوئی مول نہیں ہے ،
یہ تو بڑی نادانی ہے !
سچائی کو تہہ کر کے صندوق میں رکھ دو
خواب ہے حُسن ، بُھلا دو اس کو ،
پھول کی خوشبو ،
تاروں کی ضَو
بہکاتی ہے ،

اِن کو چھوڑ دو

چاند چور ہے

اپنے دل کو اُس سے بچاؤ

آسمان کی نیلی چادر پھاڑ کے پھینکو

پھونک دو ہر اُس چیز کو جس سے

رنج و غم یا درد و الم کی دُور دُور سے ،

پرچھائیں بھی پڑ جانے کا اندیشہ ہو ،

لہو میں جو طوفان اُٹھائے ،

من کو ایسے بَھاگ سے جلا دے

جیسے جیٹھ کی دھوپ میں جنگل

آناً فاناً جل اُٹھتے ہیں ،

پیارے !

پیار بہت ہی دُکھ دیتا ہے

آؤ اِسے دفنا دیں !

رنجش

کالی گھنگھرالی زلفوں والے بالک نے
حیران پریشاں، کھوئے کھوئے ہم کو تم کو دیکھ لیا،
اور اچانک انجانی، پاگل خوشیوں کی
پچکاری ماری،
خوشبو، عطروں، رنگوں سے ہم بھیگ گئے،
بدن ہمارے سہر گئے،
اور پاس آئے،
میچ لیں ہم نے آنکھیں
اور جب اُن کو کھولا،

ہنستے ہنستے اِدھر اُدھر دیکھا

وہ بالک غائب تھا

اور آج اُداس، غموں کے مارے، گھائل،

اُن کھنڈروں میں

بھٹک رہے ہیں

جہاں کبھی آبادی تھی،

نیلی پیلی عنّابی قندیلیں روشن تھیں،

راگوں کی برکھا ہوتی تھی،

پھولوں کے جھومر لٹکے تھے،

اور دلوں میں جیسے دنیا کی ساری دولت کے خزانے

بھر آئے تھے،

لیکن ہم آج بھکاری ہیں،

پھٹی پھٹی آنکھوں سے،

ٹوٹے پھوٹے مندر کی دیواریں تکتے ہیں،

اور اُن سونی راہوں کو

جن میں پہلے ہم تم
ہاتھ میں ہاتھ دیئے چلتے تھے،
اب ہاتھ ہمارے خالی ہیں
اور سوکھے ہونٹوں سے ہمارے
ایک ہی لفظ نکلتا ہے:
بخشش! بخشش!

ماسکو میں تین

یہ کیسی عجیب روشنی ہے،
اُجلی نیلاہٹ، صاف اور ٹھنڈی
مدھم، ملائم سوتے بچّے کے گال!
بڑی سردی ہے
چاروں اور چھتیں، سطحیں،
بن پتّے پیڑوں کی ڈالیں،
کونے کونے،
دودھیا، چمپئی سہروں سے ڈھکے ہیں،
رات بہت ہی بیت گئی ہے،
یہ شہرِ انقلاب کا مرکز
ساکت ہے، چُپ ہے،

بجلی کے کھمبے سر نہوڑائے
سُونے رستے دیکھ رہے ہیں،
اِدھر اُدھر اِکّا، دُکّا،
کہیں کہیں کالے دھبّے سفید برف پر
چلتے ہوئے نظر آتے ہیں،

اِنسان ہیں یہ:
وہ جن کو پَل بھر چَین نہیں ملتا،
وہ جن کے اَنگ اَنگ
جلتے ہیں محبت کی گرمی سے،
یا کام کی جن کو دُھن ہے،
یا جو نفرت کی بھٹّی میں جلتے ہیں،
یا پھر دن بھر تھک کر،
دیر دیر تک ہم جنسوں کے ساتھ بیٹھ کر
رات کو

امرت پیتے ہیں

اور سنہرے سپنوں سے
بے چین دلوں کو بہلاتے ہیں
یہ تین نگر چپ ہیں
یہ روسی جاپانی ہندستانی دوست
نہ جانے کون سی قسمت
کون سی دل کی انجانی دھڑکن
رُوح کی تڑپن
چُبھن نہ جانے کس کانٹے کی
اس برفیلی رات میں
اِن کو
اتنا پاس لے آئی ہے،
یہ وہ سڑک ہے جس پر لینن چلتا تھا،
یہیں پاس کریملن ہے،
جس کے پتھر گونج رہے ہیں
آج بھی اُن جانبازوں کے قدموں کی آہٹ سے،

جنھوں نے

مزدوروں کا جھنڈا

اپنا سُرخ خون بہا کر

گاڑ دیا تھا اِس دھرتی پر

آج اُسی جھنڈے کو لے کر

دہلی کلکتے ہیں ہم

جینے کا حق مانگ رہے ہیں،

اپنے دیش کو نیارا، اچھا، سندر، سب سے پیارا دیس بنا دینے کا

ٹوکیو کے لیکھک، ودیارتھی، جاپان کی جنتا،

پوچھ رہے ہیں:

"کیا کل ہم کو دنیا

ایک بار پھر

وہی جہنم تحفہ بھینٹ کرے گی

جس سے جانیں، باغ، پھول بچے ہی نہیں،

ایک بارگی بھک سے جل اُٹھے تھے،

بلکہ جیس تے ر و حوں میں بھی ،
آشا دیپ
اِک جھٹکے سے بجھا دیئے تھے''
مگر وہاں پر کون کھڑا ہے ،
تنا ہوا ، مغرور
سر اُونچا اور نگاہیں دُور
اتنی سردی میں بھی
ننگے سر ،
بٹن کوٹ کے کُھلے ہوئے
ہم رُک جاتے ہیں ،
ہم تینوں روسی ، جاپانی ، ہندستانی ،
مایا کوفسکی !
اتنی رات گئے ،
اِس طرح اور کون گھومے گا !
" تم ہم سے ملنے نکل پڑے ہو ؟

ہاں! ہاں! میں دہلی سے آیا ہوں،
اور یہ ٹوکیو ہے،
مگر تم ہم سے کل مل سکتے تھے،
پیکنگ ہوٹل میں،
رائٹرس یونین میں
یا بورِس پالی وائے کے گھر پر،
یہ تو پاگل پن ہے
موت کو دعوت دینا ہے،
صفر سے جب پچیس ڈگری ٹمپریچر نیچے ہو،
اس طرح گھومنا!"
مگر مایاکوفسکی ہنستا ہے،
ہم سے کہتا ہے،
" میں بڑی دیر سے دیکھ رہا تھا
تم بہت دُکھی ہو
رنجیدہ،

تم ظہیر، نہ جانے کیوں گم سم، مغموم،
پریشان،
اور نم پوشی ہوتا
مسکراتے بھی ہو
تو المناکی سے،
لیکن میرے بھائی، میرے پیارے،
میرے اچھّے مہمانو!
میری سنو!
اور اس پیاری روسی لڑکی کے ساتھ
ان سڑکوں پر ناچو!
داد کا پیو اور آرمینیا کی کونیاک
تمہیں خبر نہیں کیا
ہم کمیونزم بنا رہے ہیں،
اس دھرتی کے انسانوں کو،
اتنا اونچا پھینک رہے ہیں،

جتنا گگارن اور تِتو ف گئے تھے ،

ہاں ہاں یہ کام بہت مشکل ہے ،

اور امریکی کہتے ہیں ،

ہم ہرگز اس کو کرنے نہ دیں گے ،

وہ ہم کو دھمکاتے ہیں ،

لیکن زارِ بھی تو کہتا تھا ،

اور چرچل !

میرے دوستو !

ہم یہ سب کچھ کر کے رہیں گے ،

امن ، محبت ، گیت ،

یہاں بھی ،

ہندستان ، جاپان میں بھی چھائیں گے

ہم بدلیں گے ، تم بدلو گے ، ساری دنیا بدلے گی

آؤ میرے ہاتھ میں ہاتھ دو ،

ماسکو کی دھرتی پر ناچو !"

نرالی راتیں

کالی، جگمگاتی، نرالی راتیں،
رس بھری، مدماتی راتیں
رات کی رانی خوشبو سے بھری،
تاروں کی مدھم نورانی چھاؤں میں
ہلکی ٹھنڈی سی راتیں
بیساکھی ہواؤں
"سارنگی کی لمبی الکسی سسکیوں"

پیار کے رازوں سے بوجھل ،
کہانی راتیں ،
کہاں کھو گئیں ہیں یارب ؟
کھو جائیں
تو پھر کھو جائیں ،
لیکن وہ مَن موہک گھڑیاں
خون میں جیسے گھل سی گئی ہیں
وہ لڑکھڑاتے ، اَدھورے ، ناکمل جملے
اب بھی صاف سنائی دیتے ہیں
اَبروؤں ، پلکوں ، ماتھے کی شکنوں کے
بانکے ترچھے پَل پَل بدلتے زاویئے
جو کیا کیا کچھ کہتے تھے
دکھائی دیتے ہیں ،
وہ نِت نئی ، انوکھی ، بے انتہا خوشیاں
موجود بھی ہیں ، زندہ بھی

لیکن درد و الم کی موجیں بن کر
دل کے گوشے گوشے میں پھیل گئی ہیں
یہ تو سنا ہے زہر کبھی امرت بن جاتا ہے،
لیکن جب امرت خود زہریلا ہو جائے،
پھر آخر کوئی کیسے جِئے؟

کیوں آتی ہو ؟

تم بار بار کیوں آتی ہو ؟

رگ رگ میں

خون کے چلنے پھرنے کی

آواز سنائی دینے لگتی ہے ،

جئے جئے ونتی

نٹ بہاگ

فیاضؔ خاں کے

مدُھر، رسیلے بول

" جوگی مت جا ، مت جا ، "

" چھن چھن چھن پائل باجے "

ٹھمریاں :۔ " لگت کلیجوا میں چوٹ "

بہار کی نرم ٹھنڈی انگلیاں

نئی پتیوں کی ہریالی

پھولوں کے رنگ لے کر

ہلکے سے، گالوں کو چھو لیتی ہیں

تانیں، الاپ، ترانے

سنگیت کے سب گمک

گٹکری کے آبشار

ہلول کے بھنور

کمپت سُور

ناچ اٹھتے ہیں ،

شرنگار رس لئے

چاندی شہنائیاں
برسنے لگتی ہیں
جب تم بن کہے
چپکے سے آجاتی ہو،
لیکن تم نے تو کہا تھا:
"اب ہم جاتے ہیں
اور اِس طرح
کبھی نہ آئیں گے!
ملیں گے ہم تم
ایک دوسرے سے مسکراکر
باتیں بھی کریں گے،
بہت سارے کام کریں گے دنیا کے،
جئیں گے،
سانس کا ساز دھیرے دھیرے

بجا کرے گا،

اور شاید

جب پاس نہ ہوں گے

خط لکھ کر

خیریت بھی پوچھیں گے،

لیکن دل پر اپنے مہر لگا لیں گے ہم!"

کتنی اندھیاری تھی،

وہ بُری رات

جب مَن کے کواڑوں پر

بڑے بڑے لوہے کے

تالے ڈالے ہم نے،

اور کنجی کو

دُکھ کے بھیانک کالے ساگر میں

پھینک ـــــ دیا!

وہ تالے تو اب بھی پڑے ہیں،

اور ہم تم
ویسے ہی جیوت ہیں،
جیسے تم نے چاہا تھا،
بس ایک بات جھوٹی نکلی
کیوں آتی ہو؟
تم بار بار کیوں آتی ہو؟

پری

کل ہم سے ملنے ایک پری آئی !
ملئے پَوَن
سونا بدن
لٹیں بکھرے پر ڈھلکی، ہلتی
جیسے پیار سے دل بے قابو ہو کر ڈولے !
کٹیلی کاجل آنکھیں
آدھی بند
اور اُن میں
دو تارے ڈوبے،

جھل مل، جھل مل

جن سے لاکھوں

ٹھنڈی مہین کرنیں،

پھوٹ رہی تھیں

نہ جانے کیسے کپڑے پہنے تھی وہ،

پہنے بھی تھی یا نہیں

کہ صرف اک نورانی چادر

موتیا معطر سہروں کی موجیں لئے ہوئے،

عجب نرمی سے

اُس کے جسم سے لپٹی تھی،

میں اکیلا

اپنے کمرے میں

بڑی دیر سے

سر جھکائے

چُپ بیٹھا تھا ،
آنسو ، جو بہتے بہتے
دل میں جلتی لکیریں بن جاتے ہیں
جیسے سب ایک ساتھ اُمڈ آئے تھے ،
پیار کی راہ کے سارے سُرخ پھول
مہک اُٹھے تھے ،
اور کانٹے چبھتے تھے
جیسے لاکھوں نشتر
رگ رگ میں ڈوب گئے ہوں ،

وہ میرے پاس آئی
آہستہ انگلیوں سے بالوں میں میرے کنگھی کی
گرم ماتھے کو چُھوا
ٹھنڈا لطیف مخمل جیسے ،
اور بڑی اُداس

ہلکی مسکراہٹ لئے بولی
(چاندی کی گھنٹیاں بج پڑیں)
" یہ تم کو آخر کیا ہو گیا ہے ؟
کتنی وحشت ناک، بھیانک
وادی میں بھٹک رہے ہو
بھئے، نراشا، لاچاری ہی نہیں،
ابھیمان اور اہنکار کے بھی،
کالے کالے بھوت
جہاں
اندھیارے میں منڈلاتے ہیں،
تمہارا پیچھا کرتے ہیں،
کیا تم مجھ کو چھوڑ دو گے ؟
بھول جاؤ گے
اُن ہیرا سچائیوں کو

جن سے سو ہزار شمعیں تمہارے دل میں جل اٹھیں تھیں،
اور جنہوں نے تمہیں اتنی شکتی دی تھی،
کہ ظلم کی خون بھری چٹانوں سے ٹکر لیتے تھے تم
کرتیل، رتیلے، گرم میدانوں میں چلتے تھے جیسے گنگا جمنا
نظروں کو جنہوں نے تمہاری
حُسن کا جوہری،
ہاتھوں کو
رفاقت کے ستون بنا دیا تھا،
اور تمہارے سر پر
دنیا کا سب سے اچھا
انسانیت کا تاج رکھا تھا؟
اسی کا تو میں جوہر ہوں،
اُس کی تصویر!
وہ سب لوگ
جو سچ کی خاطر،

انسان کی عزت

بچوں جیسی ہنستی اُجلی نیکی کے لئے

امن و محبت کے دیوانے ہو کر

جان ہتھیلی پر لے کر پھرتے ہیں

اِس تصویر میں

بے جان دل کو لُبھانے والے

رنگین نقش بنا دیتے ہیں

دلکش تصویریں بنتی جاتی ہیں

تم بھی اِن میں رنگ بھرو!

اپنے خون کا ایک چھوٹا سا قطرہ ہی دے کر!"

یہ کہا

مُسکرائی

اور چلی گئی!

تمہاری آنکھیں

تمہاری آنکھیں
تمہاری کالی چمکتی آنکھیں
زمانے کے ساگر میں
دو آبنوسی کشتیاں
جن کی تہہ میں
تارے جڑے ہوئے ہیں
پلکوں کے مستول تھرتھراتے ہیں

ہر گھڑی ہر دَم

ہلتی ڈولتی بہتی چلی جا رہی ہیں

مت روکو اِن کو

اُنہیں لمبے دور دراز سفر کرنے دو

دُکھ کی تلملاتی لہروں

آنسوؤں کے بھنور میں

پھنسنے دو اِن کو

اور اِنہیں پھر

نت نئی، انجانی آشاؤں کے

سنہرے ساحلوں سے

ٹکرانے دو

ایسے دیسوں کے پاس اِنہیں لے جاؤ

جہاں خوشیوں کے ہیرے

پتھر کے ساتھ مِلے جُلے

چٹیل میدانوں میں

بکھرے پڑے ہوئے ہیں
اور جہاں اُونچی نوکیلی سخت
چٹانوں کے سینے
چیر کر
نازک نایاب مہکتے پھول نکل آئے ہیں
گذرنے دو
اُن مٹیالے بھورے سایوں کے
نیچے سے اِن کو
جو دل کو ٹھنڈا دیتے ہیں
اور اُن آسمانی نیلی
روشنیوں کی ہلکی مدھم ضَو
پڑنے دو اِن پر
جن سے
مَن کے سب اندھیارے
دُھل جاتے ہیں

آزاد رکھو

اپنی اِن اچھی آنکھوں کو آزاد !

برکھا میں بادل

صحرا میں آہو

بَن میں جیسے مور پپیہے ہوں !

پھر یہ تمہاری

کالی آنکھیں

آبنوس کی دو مہکتی بہکتی کشتیاں

اِندر دھنش کے

ساتوں رنگوں سے بھر جائیں گی ،

اور ہم تم سے پوچھیں گے

"بتاؤ

یہ دو آنکھیں تمہاری

ہمیں کیوں اتنی اچھی لگتی ہیں ؟"

محبّت کی موت

تم نے محبت کو مرتے دیکھا ہے؟
چمکتی، ہنستی آنکھیں پتھرا جاتی ہیں
دل کے دالانوں میں پریشان گرم لُوئ کے
جھکڑّ چلتے ہیں
گلابی احساس کے بہتے سوتے خشک
اور لگتا ہے جیسے
کسی ہری بھری کھیتی پہ پالا
پڑ جائے!

لیکن یا رب !
آرزو کے اِن مرجھائے سوکھے پھولوں
اِن گُم شُدہ جنّتوں سے ،
کیسی صندلی
دل آویز
خوشبوئیں آتی ہیں !

ایسی بھی گھڑیاں آتی ہیں

ایسی بھی گھڑیاں آتی ہیں،
جب سب شمعیں بجھ جاتی ہیں
تنہائی کے تہہ خانوں میں
زہریلے اجگر رینگتے ہیں
لوہو میں وِش گھل جاتا ہے
دُکھ اور پیڑا
لاچاری کے
ٹھنڈے گاڑھے کہروں کی چادریں

سب کچھ ڈھک جاتا ہے
کھو جاتا ہے !

انسانوں کی رنگین دنیا
آشاؤں کے جگ مگ دیپک
رشتوں ناتوں کے جال
سُبک، چمکیلے
جن سے پیار بھرے، نمناک، رسیلے رُوپوں کی
ہونٹوں کی موہوم لکیروں
مدماتی آنکھوں کی
پرچھائیں جھلتی ہے،
لفظوں کے نگینے سَو سَو رنگ بدلتے ہیں
خلوت جلوت بن جاتی ہے
اور جان کو اک تازہ وعدہ
نوروزِ مسرت، ثروتِ دل کا مل جاتا ہے

تلخاب ہلاکت اِن سب کو
برباد وزبوں کر دیتا ہے
اور صرف ہیولے وحشت کے
ویران دلوں کے صحرا میں
چنگھاڑتے ہیں اور ناچتے ہیں

آزار، خلل اور نیستی کی
یہ ناگ پھنی بھی زندہ ہے
اِس میں بھی وہ ذرّے پنہاں ہیں
طاقت کا جن میں خزانہ ہے
حرکت کا جن میں دریا ہے
تنہائیاں سب مٹ جاتی ہیں
دستِ محنت جب ملتے ہیں
یا دو دل دھیرے دھیرے ہی
پر ایک ہی گت پہ دھڑکتے ہیں

اور ذہن کی لوح پر عرفانِ آدم کے نقش اُبھرتے ہیں
تاروں کی برات نکلتی ہے
اور سب شمعیں جل اٹھتی ہیں!

جئیں یا نہ جئیں

شانتی چاہنے سے شانتی نہ ہوگی ،
بھوک لگنے سے کیا بھوجن مل جاتا ہے ؟
دانہ مٹی میں رُل جائے ،

جَل ، وایو
سوریہ کرن سے کَس بَل ،
پر پیڑ نا محنت سے لے کر
سینے میں بھر لے ،
تب کہیں نرمان شکتی کی
جوالا بھڑکتی ہے !

اکھوے جیون مدرا سے مست،
جھُومتے لڑکھڑاتے
نکل پڑتے ہیں
بے حس، بے جان ٹیلے پن کو،
نینوں کو ٹھنڈک پہنچانے والی،
ریشمی، کومل، ہری سندرتا
ڈھانپ لیتی ہے
اور بھر ڈالیاں
جھُوم جھُوم کر تالیاں بجاتی
لہک لہک کر ایک دوسرے سے گلے ملتی،
ناچتی ہیں،
نیلے آکاش کی اور اڑنے کا پریتن
اپنے بالیوں کے بھرے خزانے دیکھ کر گرگرد
کرتی ہیں،

جیسے سولہوں سنگار کیے

سندریاں،

درپن میں اپنا رُوپ دیکھ کر

لجائیں، مسکرائیں، ہنس پڑیں

یہی سنہرے دان سے بھری ڈالیاں

ہمارا جیون سادھن ہیں،

جو یہ اچھی دھرتی،

ہم کو صدیوں سے ارپت کرتی آئی ہے،

لیکن شانتی دان ہم کو،

کہاں سے، کیسے ملے گا، کون دے گا؟

" جئیں یا نہ جئیں

اب تو سوال یہ ہے"

مرتیو کا بھیانک بھوت،

یم دُوت،

پرمانو شستروں کا روپ دھار کے

سمت منشیہ جاتی کے سروں پر
منڈلا رہا ہے
اور اب تو اس کے
کالے، چکنے، بدبودار پروں کی
وحشت ناک
پھڑپھڑاہٹ کبھی
کبھی کبھی،
سنائی پڑ جاتی ہے!
جئیں یا نہ جئیں
سوال یہ ہے!
سبھتا کے نقشے کھینچے جائیں
اس دھرتی پر
یا زہریلا بناش سب کو نگل جائے
سوال یہ ہے!
یہ طاعون

پرارتھناؤں، دعاؤں

منتروں، یگیوں

اگنی کنڈ میں شُدھ گھی جلانے سے،

ٹل سکتا

تو کب کا ٹل جاتا،

نہیں!

یہ ہمارا سب سے مہان سنگھرش ہے،

اِس میں تو وجے ہمیں

تب ہوگی،

جب ہم

پھولوں کی نرم مہکتی شیتلتاؤں،

پریت کی ڈبڈبائی شبنمی آنکھوں

کے دُھندلے رنگ بیوں

دلوں سے دلوں تک چکر کاٹتی

سایہ دار راہوں،

انتہہ کرن سے پھوٹنے والے،
سب سے اگا دھ سرس راگوں
محنت کے ماتھے پر چمکنے والے پاک پسینے کے موتیوں،
چیتنا کے جگمگاتے ہیروں
کا انمول ہار
گوندھ کر
زندگی کی دیوی کے گلے ہیں
بڑھ کر ڈال دیں،
تب اس کے مستک سے
دکھ کے کھورے سائے،
ہٹ جائیں گے،
ہنس پڑے گی وہ!
اور یہ دھرتی ہی نہیں،
سارا وِشو، ہمارا ہوگا

رُک جاؤ ساعتو

رُکو رُکو رُک جاؤ ساعتو !

چلتے چلتے تھک کر پل بھر دم لے لینا

کبھی کیا تم کو دوبھر ہوگا ؟

دیکھو ! سیمیں پردے پر،

دل کے، یہ کیسے

حیرتناک رنگ

چھلک آئے ہیں !

ہلکی ہلکی دھواں دھواں تاریکی
جس میں پگھلا نیلم پھیل گیا ہے،
جس پہ کہیں عنّابی پردے ٹنگے ہوئے ہیں،
اور کہیں پر ایسی لکیریں پڑی ہوئی ہیں
جن کو اپنے خونِ دل میں،
ہاتھ ڈبو کے،
ٹیڑھی میڑھی
کسی نے جیسے کھینچ دیا ہو
مگر ذرا ٹھہرو، دیکھو تو
یہ تو شاید پگ ڈنڈی ہے
جس پر چل کر،

دھیرے دھیرے
جیسے میٹھی نیند آتی ہے
یا پھولوں کی مہک آتی ہے
وہ آتی ہے،

جس نے ہم سے پیار کیا تھا ،
جس کے ہونٹوں کی تھرتھراہٹ
نظروں کی ضَو
زباں کی نرمی
جس کے ہاتھ کی اُلجھن
سینے کی مُبہم بے چینی
زیست کے سارے درد و الم کی آگ چھپائے
جان کی گرمی ،
یوں تھی میری ،
جیسے یہ سپنا میرا ہے !

پل بھر تو رُک جاؤ ساعتو !
رُکو رُکو تھم جاؤ ساعتو ،
تم کو رحم نہیں کیا آتا ؟

پرانی دیوار

پُرانی، بہت پُرانی، کائی لگی دیوار
لکھوری اینٹوں کی
اتہاس نے اپنے لمبے لمبے ہاتھوں سے جوڑوں کو جس کے باندھا ہے
اور گلابی، بھورے، سبز ہلے جُلے دھبوں سے جس پر لاکھ کہانی
لکھ ڈالی ہے،
البیلی کرنیں روز صبح چپکے سے اُس پر چڑھ جاتی ہیں،
اِدھر اُدھر پھر جھانکتی ہیں،
اور ایک ایک کرکے دبے پاؤں
کونوں میں اُس کے ٹک جاتی ہیں
دوڑ دوڑ کر آنکھ مچولی کھیلتی ہیں،

لجّا سے چُور لتا ہنوڑائے سر مُسکاتی ہے
ہلکے سے اس کے دامن سے دو چار پھول ٹپک جاتے ہیں
بہر اُٹھتا ہے سبزہ !

آسمان نے آج اسے پھر
رنگ لطافت خوشبو کا یہ کومل تحفہ
بھینٹ کیا ہے
من اس کا یہ دَولت
پاکر کبھی بھر آتا ہے
یہ آنند اَننت نہیں ہے
مگر یہی اِسپرش
ہزاروں تاروں میں جیون دِنیا کے
رس بھرتا ہے،
اور پھر اس سے ایسے راگ نکلتے ہیں،
جو کبھی نہیں مرتے !

اِس دیوار کے سائے میں

اِس اُپوَن میں

سَرو کھڑے ہیں بالکل سیدھے

ساکت چُپ

اشوک بڑی گھمبیر سوچ میں گُم

پُرانے مندر جیسے

کنول کی کلیاں

ہری ہری ساری پھیلائے

تیر رہی ہیں،

اور فوارہ ہلکے ہلکے یوں چلتا ہے

جیسے صبح کو بالک

سوئی ماں کے ڈر سے

سِسک سِسک کر بلکے

کبھی کبھی

کبھی کبھی بیحد ڈر لگتا ہے :
کہ دوستی کے سب روپہلے رشتے ،
پیار کے سارے سنہرے بندھن ،
سُوکھی ٹہنیوں کی طرح ،
چٹخ کر ٹوٹ نہ جائیں ،
آنکھیں کھُلیں ، بند ہوں ، دیکھیں ،
لیکن باتیں کرنا چھوڑ دیں
ہاتھ کام کریں ،

انگلیاں دنیا بھر کے قضیئے لکھیں،
مگر بھول جیسے بچّوں کے،
ڈگمگاتے چھوٹے چھوٹے پیروں کو
سہارا دنیا بھول جائیں،
اور سُہانی، شبنمی راتوں میں
جب روشنیاں گُل ہو جائیں،
تارے موتیا چمیلی کی طرح مہکیں،
پریت کی ریت
نبھائی نہ جائے،
دِلوں میں کٹھور تا گھر کرے،
من کے چنچل سوتے سوکھ جائیں،
یہی موت ہے!
اُس دوسری سے
بہت زیادہ بُری
جس پر سب آنسو بہاتے ہیں،

اَرتھی اُٹھتی ہے،
چِتا سُلگتی ہے،
قبروں پر پھول چڑھائے جاتے ہیں،
چراغ جلتے ہیں،
لیکن یہ، یہ تو
تنہائی کے بھیانک مقبرے ہیں،
دائمی قید ہے،
جس کے گول گنبد سے
اپنی چیخوں کی بھی،
باز گشت نہیں آتی
کبھی کبھی بے حد ڈر لگتا ہے!

تمہارے بِنا

تمہارے بِنا جیون بِتانا
ناممکن مشکل نہیں
سہل ہے،
آنسوؤں کی شبنم چلمنیں
پران کے دریچوں پر
پڑی کپکپائیں گی
پاگل کامناؤں کی نشیلی ہوا
من کی گلابی پتھر جالیوں

آڑے ترچھے بانکے نقشوں کے آر پار،
سَن سَن دوڑے گی،
یادوں کے پُرانے گنبد سے
اندھیری راتوں کے سنّاٹے میں
جب پُروَیّا بہے گی
رَاگنیوں کی سِسکیاں
سنائی دیں گی،
تمہاری سب مُسکراہٹیں، پھول،
کالی آنکھیں، جادُو
انگوٹھی کے نگ،
پیار کی مُہریں
بن جائیں گے،
تمہارے بدن کا باغ
لہک اُٹھے گا

جیسے سوکھی، تپتی دھرتی
برکھا کے پہلے چھینٹوں سے
سوندھی خوشبوئیں لئے

جاگ پڑے

تمہارے شہر کے سب پوشیدہ
نیلم، ہیرے، یاقوت
جھلکیں گے،
کنوار کاتک کے دُھلے اَنبر پر
تاروں کے جُھومر کی طرح
لیکن سُنو!
اِن بھرے خزانوں
اِن مہکتی بہاروں کے بیچ
تمہارے بنا زندہ رہنا
اتنا سہل ہوتے ہوئے بھی
بہت مشکل ہے!

بس ایک قطرہ

وقت کے لامحدود سمندر سے بس ایک قطرہ
لا متناہی فضاؤں کا صرف ذرا سا ٹکڑا
کتنے جتن ،
کتنی صدیوں بعد
ملا ہے ہم کو ،
اُس کو بھی
شکستوں، نامُرادیوں کے
تیزابی دھارے ،

ظلم و عداوت کے ریتیلے جھکّڑ،
نفرت کے طوفان
کبھی کبھی
یوں لگتا ہے،
ہم سے چھین لیں گے
لیکن ہمالیہ کی،
نجانے کن
سبز صنوبر وادیوں سے
زندگی کے اِس پتھریلے خارزار میں بھی،
خوشبوئیں آتی ہیں،
یکایک اودی گھنگور گھٹائیں
چھا جاتی ہیں،
اور امرت برسنے لگتا ہے
کیا اِن ہواؤں نے،

تمہارے لبوں کی
پنکھڑیوں کو
چُوم لیا ہے ؟
کیا یہ بادل
تمہارے بالوں کو
چُھو کر اُٹھے ہیں ؟

انتظار

ایک تو موت کا انتظار ہوتا ہے
جب بے حسی بیہوشی کے دُھندلکوں میں
آپا ہیچ خون کی گھسٹی چال
درد کی بے انداز سوئیوں کی چُبھن
دل کے سب سے نازک رشتوں کی
حیرتناک پرچھائیاں
اُبھار دیتی ہے :
بہشت جو ہم یہیں چھوڑ چلے

مہین کرنوں کے نرم سنہرے ڈوپٹے اوڑھے
سانجھ کی سانولی سلونی رنگینیں
سہانی اُداسیاں
نیند بھری اکساہٹ لئے
دُور دُور تک پھیلے سبزہ زار!
دیوتاؤں کے بڑے بڑے پیالوں میں بھرا
نرمل نیر
خاموش چمکتی نیلی جھیلیں،
جل ترنگ بجاتی نہریں
بَل کھاتی، البیلی،
پُراتن دیو داروں سے،
اپنے پتھریلے سینے چھپائے
گہرے سبز، ٹھنڈے سایوں کے
موٹے کمبل اوڑھے
اُونچے پربت

سُرمئی گگن کی کمان میں
کالے بل کھاتے تیر
مرغابیوں کی قطاریں،
پیار کے رس میں ڈوبے
شرمیلی موہوم مسکراہٹوں کے
گھونگھٹ کاڑھے
جھلملاتے روپ،
اماوس راتریوں کا
کالا جادو چراتے
مدماتے نَین
اور وہ ساری سُندر ابھیلاشائیں، کامنائیں،
جن کی پیڑا
اور جن کی پُورتی سے
جیون اُپوَن ہیں

نیلے، پیلے، اُودے، سُرخ، سفید
لہلہلاتے پھولوں کی
کیاریاں کِھلتی سجتی گئیں
خوشبوؤں کی پھوار پڑنے لگی
سُورگ کے یہ سب سنہرے رنگیا چتر،
اُس مشکل دردناک سمے
صاف دکھائی دیتے
راستہ روک کر
کھڑے ہو جاتے ہیں،
جب آنسو بہاتی موت
سرہانے آکر ہمارے شانے ہلاتی
اور بار بار کہتی ہے
جلدی کرو جلدی
ہمیں چلنے میں دیر ہو رہی ہے

لیکن دوسرا

برکتوں کا انتظار،

زندگی کی اُن دھڑکنوں کا

جنھیں بس پیار کے کان سُنتے ہیں،

اُن خوشیوں کا

جو رگوں میں خون کے ساتھ

دوڑتی ہیں،

اُن بھلائیوں اچھائیوں کا

جن کے روپہلے اِسپرش سے،

کٹھنائیوں کی بند کلیاں

چٹک کر پھول بن جاتی ہیں

کتنا سخت

دُکھ دائک ہوتا ہے

اِن کا انتظار

تپش اور جلن ہوتی ہے اُس میں
اور جان لیوا گُھٹن،
فضا گرم تانبے کی رکابی سمان
دہکتی ہے،
سوئمّ آتما پُھنک اُٹھتی ہے،
اور لگتا ہے جیسے،
کرُنا کے بادل
کبھی نہ برسیں گے

کالا پھول

گھنے بھیانک اندھیروں کی تہیں چیر کر
اِک کالا پھول نکل آیا ہے،
کومل، مُلائم، نم پنکھڑیاں
جیسے اُس بپتا کی ماری کے،
آنسوؤں سے تر گال
جس کا پتی رن بھومی سے نہیں لوٹا،
چِتا میں جلتے صندل کی سی مہک ہے اُس میں،

سوگوار، درد کا پیکر پھول ،
اُس کی معصوم رنگت
سہانی خوشبو
کہاں کھوگئی ؟
اِن ٹہنیوں، شاخوں کے بھیتر
جیون رَس اب بھی دوڑ رہا ہے ،
لیکن اُس میں لہو کی ملاوٹ ہے
اُن کا جو یانگ تسی اور ہوانگ ہو
گنگا اور جمنا کے میدانوں سے ،
اپنی کھیتیاں کھلیاں ،
بیوی بچے ، گھر بار
سب تج کر
اِن سنسان وحشت ناک
ہمالیائی برفانی صحراؤں میں آئے
اور اچانک موت کے شکنجے میں پھنس گئے !

اور اب اپنے مہکتے بچوں کو
گودیوں میں کھلانے
اپنی چھوٹی بہنوں کا بیاہ رچانے
ڈھولک گیتوں کو سُننے
یہاں سے کبھی نہ واپس جائیں گے
اِس دھرتی میں اُنہیں کا خون جذب ہے
اور یہ کالا پھول،
شاید دنیا کے سب سے درد انگیز المیہ کی نشانی ہے
اگر یہ سچ ہے کہ انسان کی کہانی
آدم کے گناہ
اور ہابیل کے ہاتھوں قابیل کے قتل سے
شروع ہوتی ہے
تو یہ گناہ اور جرم تو،
اُس سے بھی بڑا ہے
کہ چینی بھائی، ہندوستانی کا،

ہندوستانی چینی کا خون بہائیں

یہ بات جھوٹی نہیں، سچی ہے،

ہزار بار، سو ہزار بار

کہ ہم دونوں بھائی بھائی ہیں

اور جب لاکھوں کروڑوں

ایک ارب انسانوں نے

ہندی چینی بھائی بھائی کا نعرہ بلند کیا تھا،

تو وہ آواز اتنی ہی سچی تھی

جتنی شاکیہ منی کی بانی

جو بھارت اور چین

دونوں میں گونجی

اور جس کے جادو سے راکھ سونا بن گئی

کیا کرودھ اور لوبھ

گھِنا اور ہنسا کے آپاسک

ستیہ کو استیہ ثابت کر دیں گے؟

بربرتا کی کالی آندھیاں
مَنشتیا اور رکرُتا کی
مشعلوں کو بجھا دیں گی ؟
گاندھی کو قتل کر دو
لیکن اُس کی مہان آتما
سداکو ہِ نور کی طرح
جگمگاتی رہے گی
پونجی واد کی خونی چکی
اب بھی چلتی ہے
سامراج ابھی مرا نہیں
نامرد بڈھے کھوسٹ کی طرح
اِس حسین دنیا سے چمٹا ہے
لیکن
اِنسانوں کے سب سے شوخ، جھلملاتے
آدرش کی افشاں، سامیہ واد سے

زندگی کی پیشانی تابندہ ہے،
ابھی تو اِس دھرتی پر
اُس جگہ جہاں بھارتی اور چینی
خون بہا تھا،
صرف ایک کمزور سا
نازک، کالا، سوگوار پھول نکلا ہے
اِس سچائی کو بتانے
کہ پھول کی خوشبو،
بارود کی بو سے بہتر ہے
اِس التجا کے ساتھ کہ فوجی بوٹ
چاہے ہندوستانی پیر میں ہوں
یا چینی میں،
اب پھولوں کو نہ کچلیں گے
اور اِس وعدہ کے ساتھ
کہ اِس اچھی دھرتی میں

ایک ہی نہیں
ہزاروں، لاکھوں، لاتعداد
پھولوں کے نگینے پوشیدہ ہیں،
وہ سب نکلیں گے،
اور اس سوندھی مٹی کو ہی نہیں،
سارے ایشیا کو رنگ و بو
اور سب کے دلوں کو
امن و مسرّت سے بھر دیں گے!

بلّور کے پیالے

ترشے بلّور کے شفّاف پیالے
روشنی کے چلنے ریشمی دھاگوں سے
سینے کے زخم بھر لیتے ہیں
یہ آنسوؤں سے تر زندگی
نامرادیوں کے دھندلے صحراؤں میں بھٹکتی
گناہ کے سیاہ دھبّوں سے داغدار
اضطرابوں کے بھنور میں پھنسی
ملامت کے کانٹوں کی چبھن سے مضمحل ہے ،

نیزابی تلخیوں سے بھر گئی ہے،

وہ تو،

تمہاری اچھائیوں اور نیکیوں کا کم

دلنواز کمزوریوں کا

سہارا ڈھونڈھتی ہے

خجل مسکراہٹوں

اپنی باتوں کے دھیمے اَن سُنے نغموں

بے ساختہ لغزشوں

کے چراغوں کی،

ٹمٹماتی روشنیاں جلادو،

اور پھر

اِس ترشے بلّور کے شفّاف پیالے میں بھری

سنہری شراب پر

اپنا ماہتابی عکس پڑنے دو!

دل نے پوچھا

کل چپکے سے،
اک شرمیلے دل نے ہم سے
دھیرے دھیرے،
کچھ رُک رُک کر
پوچھا!
"دیکھئے آخر آپ جو لکھتے رہتے ہیں،
اتنی بہت سی باتوں
طرح طرح کی چیزوں پر

نظمیں، مضمون، کتابیں،
کبھی ہمارے بارے میں بھی
کچھ لکھئے!

بات یہ ہے
ہم چاہتے ہیں
یعنی،
ہم دونوں چاہتے ہیں،
کہ لوگ ہمیں کچھ سمجھیں
اور یہ باتیں
طرح طرح کی
جھوٹی سچی
جو پھیلی ہیں
ہم کو لے کر
اُن کی حقیقت

لوگوں کو
تھوڑی سی ذرا
معلوم تو ہو!"
میں نے کہا:
"میرے اچھے دل
پیارے دل
مجھ کو لگتا ہے
تم دو تو ہو
یعنی تم
اور وہ تم سا دوسرا دل

بہت ہی بھولے ہو،
ڈھونڈ رہے ہو
اُن کا سرا
جن لچھّوں میں

ہستی کے جن نرم سنہرے لچھوں میں،
تم اُلجھ گئے ہو،
لیکن دیکھو،
ذرا تو سوچو
اور بتاؤ
پھول سے خوشبو
کیا کہتی ہے
کس نے سنا ہے؟
رات کی رانی
اپنا آنچل
جھل مل جھل مل تاروں سے
کیوں بھر لیتی ہے؟
معنوں کے موتی لڑی کیوں
لفظوں کی گردن میں پڑی ہے؟

بے معنی آوازوں کے صحرا سے کیسے
راگ اور لَے کے
چنچل سوتے
اُبل پڑے ہیں ؟
گنگا جمنا
بہت دنوں تک
بہت دور تک
بہتے بہتے
سنگم پر جب مل جاتے ہیں،
آخر اس کی حقیقت کیا ہے ؟
اے دل اپنے اِن رازوں کا
بھید نہ ڈھونڈھو!
یہی اکیلی وہ دولت ہے
جس کو تم خود کھو سکتے ہو،
تم سے کوئی نہیں لے سکتا

بے پَر کا فرشتہ

خود اپنی تعریف نہ کرنا چاہیئے
لیکن اگر بات
سچّی ہو،
تو کہہ دینے میں ہرج کیا ہے؟
اور آج کہے بِنا
رہا نہیں جاتا،
بُری لگے تو معاف کر دیجئے گا!

تو بات یہ ہے
کہ مجھے لگتا ہے،
نہیں بلکہ یقین ہے کہ
میں فرشتہ ہوں،
بے پر کا!
میں نے اپنے مَن پر
اپنی سب اندریوں
پانچوں حواس پر
قابو پالیا ہے،
ماس، مچھلی، مرچ، مسالہ
چھوڑ دیا ہے،
اُبلی یا کچّی سبزیاں
کھاتا ہوں اور
روزانہ رات کو

آدھ سیر گرم دودھ پی کر
سو جاتا ہوں،
دھومرپان ایک دم نشید
شراب کی بو سے نفرت،
پرائی عورت کو
آنکھ اٹھا کر دیکھا نہیں،
پریم محبت کے چکر میں پڑا نہیں
بس بیوی ہے میری اور میں ہوں!
اپنے بچوں کی ضد،
کبھی پوری نہیں کی
ہمیشہ انہیں کڑے، سیدھے،
سدآچار کے مارگ پر
چلانے کا پریتن کیا
وہ نہیں چلے
تو یہ ان کا دُربھاگیہ

میں نے تو اپنے
کرتبیہ کا پالن کیا !
سُنتا ہوں مرا بڑا لڑکا
سٹّہ کھیلتا،
چھوکریوں کے پیچھے
مارا مارا پھرتا
اور روز شام
لفنگوں کے ساتھ بیٹھ کر
مَدِرا پیتا ہے،
تو میں کیا کروں ؟
دل کڑا کر لیا
اور اب اُس کا
مُنہ بھی نہیں دیکھتا،
وہ نَرک میں جاتا ہے تو جائے،
میں کیوں اپنے راستے سے ٹلوں ؟

میں نے درڑھ نشچے کر لیا ہے،
کہ کوٹی کوٹی بھارت باسیوں کو
اپنی طرح فرشتہ بنا کر دم لوں گا
اِس پوتر بھومی میں
لوگوں کو
بس ترشیتل جل،
دودھ
اور نیبو پانی پینے کو ملے گا
بیشک لوگ آم چوسیں
کچے ٹماٹر، چکھیں،
اور جی چاہے تو گھی سے چُپڑ کر
پُھلکے، بھاجی اور دال کھائیں،
اور دھنیا کی چٹنی چاٹیں
پرنتو رشیوں، مُنیوں،

سَنت اور سادھوؤں کے

اِس مَہان دیش میں
کسی بِکشُو یا بِکشُنی کی ہتھیا،
کامی ہتھیاروں کے
پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لئے
ہم نہیں ہونے دیں گے!
بھوجن پَوشٹِک ہو،
نُوکام کرو دھ اور لُوبھ
اَرتھات پاپ کی جڑ کٹ جائے،
سب کا اُدّھار ہو جائے،
ہمارے سب درِدّر مٹ جائیں،
اور امریکہ اور روس دونوں
یہ کامی اور لوبھی دیش،
ہمارے قدموں پہ ناک رگڑیں!

بالکل ویسے،
جیسے میری پتنی
میرے چرنوں میں پڑی
گائے کی طرح
بِگھُراتی ہے،
ہے پردھان منتری جی!
میری بس ایک پرارتھنا ہے
بھارت کلیان کا مجھے اَوسر دیجئے
اور آچار پری ورتن کی
پنج ورشیہ یوجنا میں نے جو بنائی ہے،
اُسے پلاننگ کمیشن کے سپرد کر کے،
کیندریہ منتری منڈل میں
ایک، بس ایک، اضافہ کیجئے
آچار منتری کا!

یہ ناچیز، بے پر فرشتہ ،
بڑی نمرتا کے ساتھ
آپ سے یہ نوید ن کرتا ہے ۔
کیونکہ
آخر آپ بھی تو بھارت کا اُتھّان
چاہتے ہیں نا!

برسات کی رات

بھیگی بھری اوڑھنیاں اوڑھے
جُوہی، چنبیلی
چمپا، کامنی
رَس بھری ہواؤں کے
تھپیڑوں سے
کپ کپاتی ہیں
گھُپ اندھیرے میں
جگنوؤں کی بے آواز بوندیں
ٹپکتی ہیں،

بیا کُل رات

خاموشیوں کے سنگیت میں
ڈوب گئی ہے،
مہکتی سانسوں کے
نم جھونکے
دبے پاؤں
بھیتر آکر
بند آنکھوں کو
ہلکے سے چوم لیتے ہیں
لیکن وہ لجاتی مُسکراتی کلی
اِدھر کا رستہ بھول گئی
یا اندھیارے کی چادر تان کر
وہیں کہیں باہر
باغ میں سو گئی

اُشا

اُشا

اوس جیسی خاموش

نکھر ستھراتی ،

پیار کے پہلے بوسے کی طرح

سہمی ، لجاتی ،

ہزاروں تمناؤں کی

مُسکراتی گلابیاں

مُکھڑے پر بکھیرے

کتنے دبے پاؤں آئی ہے،
اور ایسا لگتا ہے کہ
جھک کر
کان میں
کسی رہسیہ کا اَمرت
گھول دے گی
لیکن نیند کے دُھندھلکوں سے بوجھل
ڈبڈبائی آنکھیں
رہ رہ کر،
دِھیمے دِھیمے،
اُس سے یہی پوچھتی ہیں
بدنصیب !
تو نے میرے
اُس چمکتے ستارے کو
کہاں چھپا دیا ؟

نیا سال

آسمان کے سب کواڑے کھول دو
اور اِس بجھی بجھی دھرتی کو
کائناتی کرنوں کی
سیمابی روشنیوں سے نہلا دو،
کاماناؤں کے سُنہرے تاروں سے جگ مگاتا
لال جوڑا اُسے پہناؤ
خوشبوؤں کی صندل سے مانگ بھرو

اور ماتھے پر
اُمید کی
جھلملاتی تِھُکلی لگا کر
بے قرار تمناؤں کی چُل بُلی
شریر انگلیوں سے
آسے اِتنا گُدگُداؤ
کہ وہ کھِل کھِلا کر ہنس پڑے
ہمارا اَنا دا اکیلا پن
ٹوٹنے والا ہے
ہم نے زُہرہ کی پیشانی چوم لی ہے
اور چاند کے گلے میں باہیں ڈال دی ہیں
مِرّیخ کے بُرجوں سے
اَب جنگی نقاروں کی نہیں
پیار اور محبّت
اَمن اور مَسرّت کی

سُریلی شہنائیاں
سنائی دینے لگی ہیں
اِنسان کی بَرات
بڑے دھوم سے
نکلنے والی ہے

اگر ایسا ہوتا...

اگر ایسا ہوتا
کہ سب اِن طِلسمی کرنوں کو
جو تھرتھراتی،
باریک، بے حد نرم
اور جن کی جھِلمِلاہٹیں
اوس کی طرح ٹھنڈی تھیں
اور جو بہار کے پہلے پھولوں کی
ہلکی ہلکی مہک—

اور ہلکی سرا سیمہ رنگتوں کو
نہ جانے کیسے چرا کر
کسی کونے کے بھولے بسرے جھروکے سے،
دل کے اندر گھس آئی تھیں
اگر ایسا ہوتا،
کاش کہ ایسا ہوتا
کہ ہم انہیں گرفتار کر سکتے!
کتنی بدل گئی تھی
تب دنیا،
اور اُس کی ہر چیز:
زندگی
یوں لگتی تھی
جیسے سیب کے گلابی شگوفوں سے بوجھل
ایک دُلہن ڈالی،
یا گُل مہر کی سُرخ ناچتی چھتری۔

یا نیلے آکاش سے بہنا ،
اَملتاس کی سونا اشرفیوں کا جھڑنا ،

جلن کے سانپ ،
شک اور شبہے کے بچھّو
اَہنکار کے اَجگر
لال پیلا غُصّہ ،
خونی دشمنیاں ،
کٹّر پَن کے بند کواڑ ،
کالی زہریلی نفرتوں کے کٹیلے تار
سب گُم تھے ،
اور آسمان سے
چاروں طرف
جھَم جھماتی رس کی بوندیں ،
برس پڑی تھیں

لیکن آج

دل روتا ہے ،

اور کہتا ہے :

" بس ایک کرن ،

کہیں سے ،

اُس سہانی شبنمی روشنی کی ،

بس ایک کرن ! "

کھوئی کھوئی سی
اَلم ناک، بوجھل رات
ختم ہونے کے قریب آ تی ہے
اور بے چینی خود
تھکی ہاری بے ہوشی کے
گلے میں باہیں ڈال کر
سو جاتی ہے،
اُنہیں،
بھور کے اَدھ جگے، اَدھ سوئے
دھندلکوں میں
ایسا لگتا ہے
کہ میری بند
آنسو بھری
ڈبڈبائی آنکھوں کو
کسی نے ہلکے سے چُوم لیا

کیا تم بیچ سکتے ہو؟

(کیوبا کے شاعر نکولاس گیلن کی نظم کا آزاد ترجمہ)

جب تمہاری انگلیوں کو پکڑ کر
ہوا دوڑتی ہے،
گال پر تھپیڑے مارتی ہے،
یا کبھی کبھی جب ایسا لگتا ہے
تمہارے قدموں کو جکڑے گی
کیا تم بیچ سکتے ہو اُس ہوا کو

میرے ہاتھ
پانچ روپے میں ؟
طوفانی ہوائیں، نرم جھونکے،
بیچ سکتے ہو نہیں تم ؟
وہ جو تمہارے باغ میں اٹھکھیلیاں بھرتے ہیں
پھولوں کی سنہری گرد
مٹھیوں میں بھر کر
چڑیوں کو اُڑا دیتے ہیں
تتلیوں کے پروں میں بھر جاتے ہیں
بادبانوں کی طرح
اِن نازک جھونکوں کو
دس روپئے میں بیچو گے ؟
وہ تو کسی کے نہیں
ایسا کوئی نہیں کر سکتا !
کیا آسمان کو بیچ سکتے ہو،

آسمان،
جو کبھی نیلا ہوتا ہے، کبھی سُرمئی
اُس کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا
جسے سمجھتے ہو اپنے باغ کی طرح
تم نے خرید لیا،
یا اپنے مکان کی چھت کی طرح
اُس کا چھوٹا سا
ڈالر بھر کا ٹکڑا
بس دو کلو میٹر
بیچو گے؟
لیکن آسمان تو بادلوں کا ہے
اور بادل بہت اُونچے اُڑتے ہیں
وہ تو کسی کے نہیں
کوئی ایسا نہیں کر سکتا!
کیا تم بارش کو بیچ سکتے ہو؟

اُن قطروں کو جو کبھی آنکھوں میں آنسو بنتے ہیں،
اور کبھی تمہاری سوکھی زبان کو
تر کرتے ہیں،
یا چشموں میں بہہ نکلتے ہیں
انہیں ایک ڈالر میں دوگے ؟
شاداب بادل
نرم جیسے میمنے
یا وہ پانی جو پہاڑوں پر برستا ہے
یا جو جڑوں میں
پڑا رہ جاتا ہے،
اور پیاسے کتے جنہیں پیتے ہیں،
یا کوس بھر سمندر
یا شاید کوئی جھیل
وہ نوگرتا ہے
بہتا ہے،

وہ کسی کا نہیں

کسی کا نہیں !
کیا تم زمین کو بیچ سکتے ہو،
جَڑوں کی گہری راتوں کو
اُس دھرتی کو
جس میں لاکھوں سال پُرانے
لاپتہ، عجیب و غریب ہاتھیوں کے دانت،
اور چرنے میں گُھلے مِلے،
ہڈیوں کے ڈھانچے
دھنسے پڑے ہیں
کیا اُن جنگلوں کو بیچ سکتے ہو
جو صدیوں سے دفن ہیں ؟
اُن چڑیوں اور مچھلیوں کو
جو پتھر بن گئی ہیں
جو لاکھی پہاڑوں کی گندھک کو

جو لاکھوں کروڑوں سال سے

تہہ بہ تہہ ،
جمی پڑی ہے،

بتاؤ
کیا اس زمین کو بیچ سکتے
بیچ سکتے ہو اس زمیں کو
بتاؤ مجھے تم !
یہی تمہاری دھرتی ،
میری بھی ہے،
اس پر تو سب کے قدم چلتے ہیں
یہ کسی کی ملکیت نہیں ،
کسی کی نہیں !

نہ رہے بانس نہ بجے بانسری

(۱)

جب جیب خالی ہو
یا بے روزگاری ہو
قرض دینے والے آنکھیں دکھائیں
اور گھر کے بچّے
ہنسنا چھوڑ دیں
بیوی لڑنا
اور طعنے دینا،

تب بھوک
کتنی بھیانک ہوتی ہے !

(۲)

لیکن بھائی !
بھوک تو کوئی بُری چیز نہیں،
وہ تو صحت کی نشانی ہے
نہ لگے تو جینا دوبھر ہو جائے
ہم مُنہ لٹکائے
ڈاکٹروں، حکیموں، ویدوں کے پاس
دوڑے دوڑے جائیں
اور کہیں :-
"بھوک ماری گئی ہے
شریمان! بھوک لگنے کی
کوئی دوا دیجیئے !"

(۳)

لیکن آج کل
ہندوستانی جنتا کی
مَت ماری گئی ہے
کہ بھوک مٹانے کو
لڑنے کھڑی ہوگئی ہے،
غلّہ گوداموں اور بنکوں پر
ستیہ گرہ کر کے

پچاسوں ہزار
جیل بھرتے پھرتے ہیں
لیکن دَھنیہ ہو سرکار کا
اُس کی پولیس اور پولیس کی لاٹھیوں کا
اور جَن سنگھی سوئم سیوکوں کا
کہ کالا بازار کرنے والوں
اور سٹّے بازوں کو

بچا لیا ،
اور کمیونسٹوں ، اور سوشلسٹوں کو جیل میں بند کر دیا ،
آخر گاندھی جی کے چیلوں کی سرکار
نیائے مارگ پر تو چلے گی ہی !
چور بازار میں چھپا
اناج ہی نہیں بچا ،
راشٹر کا سواستھ بھی سلامت رہا !

(۴)

اور اَب سُنا ہے
اِس روز روز کے جھگڑے سے
بچنے کے لئے
پردھان منتری نے
سواستھ منتری کی اَدّھکشتا میں ،
ایک نئی کمیٹی بنائی ہے
جسے آل انڈیا سائنٹفک ریسرچ کونسل سے کہا ہے

کہ باقی سب کام بند کر کے
ایک ایسی گولی تیار کرے
جس کے کھا لینے سے
جنتا کی بھوک مر جائے
بس تھوڑے دن
لوگ اور صبر کریں
ڈاکٹروں کا کام بھی
ہلکا ہو جائے گا
سرکار کا بھی
عوام کا بھی
کمیونسٹ اور سوشلسٹ پارٹی کا بھی،
برتھ کنٹرول کی
گولیوں کے ساتھ ساتھ
بھوک کنٹرول کی گولیاں بھی
مفت تقسیم ہوں گی

ہماری گاندھی وادی سرکار
جنتا کے روگوں کو
شانتی پُورَوَک
جلد ہی دور کر دے گی
کھادیہ سنکٹ
ہمیشہ کے لئے مٹ جائے گا

اور پھر،
نہ رہے گا بانس،
نہ بجے گی بانسری!

بناوٹوں کے قمقمے

کتنا بُرا بدمزہ وقت ہے
مُنہ میں جیسے راکھ بھر گئی ہے
نیکیاں تک
پُرانی گھِسی پٹی رسموں کی طرح ہیں
سب کاغذ کے پھول
ٹیڑھے، ترچھے، اکڑے
اکثر کے رنگ اُڑے

اور اُن پر نہ جانے کتنی صدیوں کی دھول،
پچیلی، نرم ہری ٹہنیوں کی جگہ
لوہے کے مورچہ لگے تار!
خوشیاں کھوکھلی
بس عادتیں
نہ آہنگ اُن میں، نہ تازگی،
اور نہ سچائی کی تمتماہٹ،
مسّرت کے صاف چشمے
دل سے نہیں پھوٹتے،
گدلے کائی لگے مرے پانی کی
ٹوٹی پھوٹی باؤلیاں،
مسکراہٹ، ہنسی
ہونٹوں پر یوں آتی ہے
جیسے ٹین کا جاپانی جوکر
کوک دینے پر

کرتب دکھائے،
چکنے ٹکنے
پتلونوں کی سیدھی کریزوں کی طرح کھنچے ہوئے،
خالی چہرہ مرد،
نائلونی عورتیں
موم کی پتلیاں،
باتیں یوں
جیسے اسکول کے غبی لڑکے
رٹے سبق دھرائیں،
جسے کام نہیں
مکھیاں مارتا ہے
جسے کام ہے
مشین کے پرزے کی طرح
سویا سویا چل رہا ہے،
محبت خود

ایک بڑی پیاس بن گئی ہے
جسے بے تحاشہ
ٹھنڈے پانی کے گھونٹ پی کر بجھا دیں ،
آؤ ہم اور تم مل کر
بدل دیں یہ زمانہ
بناوٹوں کے سب قلعے توڑ دیں
جھوٹ کے اُونچے اُونچے پشتوں میں
شگاف کر دیں
اور زخموں سے چُور
بے چاری قیدی محبت کو
رہا کر کے
پاسپورٹ اور کسٹمس کی تلاشی بغیر
جٹ ہوائی جہازوں
اور راکٹوں سے بھی زیادہ تیز
دنیا کے سب ملکوں میں جانے

اور سب کے دِلوں میں
گھر بنانے کی آزادی دے دیں
اور پھر
تمہاری کالی آنکھوں کے جادو
مُدھر بول سے جیسے
دل کی بند گرہیں کھل جاتی ہیں
تھوڑی دیر کو ہی
رَنج مٹ جاتا ہے
سب اِنسان
دراصل
اور ہمیشہ کے لئے
زندہ ہو جائیں !

پھول

پھول اک ہدیۂ رحمت ہے، نعیم اور کریم

اک تقاضہ ہے محبت کا ملنساری کا

رنگ سے اپنے تپاں شوق فراواں کی طرح

ایک پیغامِ دل افروز ہے دل داری کا

برہنہ سینے پہ کرنوں کی چبھن سے لرزاں،

دردمندی سے عیاں حسن دل اَفگاری کا

عطرِ اُمید چھپائے دلِ خوں گشتہ ہیں،

سرِ شوریدہ پہ کج تاج طرحداری کا

عشرتِ رحمتِ تخلیق کا مظہر، گُل تر،

صدفِ حُسن میں اک قطرۂ نیسانِ حیات!